عن النالیف" ہے جو تین ابواب پر مشتمل ہے اور ابن سینا کی القانون کا ایک حصہ جو کافی مشہور رہا اور اس کے یورپی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ سرجری سے متعلق نہیں بلکہ تشریح یعنی اناٹومی سے متعلق ہے۔

فاضل مقالہ نگار جو شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی میں لکچرر ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک عرصہ تک اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی میں بھی تدریسی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اگر وہ وہاں کسی سے رابطہ قائم کر لیتے تو مضمون ان خامیوں سے پاک ہوتا۔

موخرالذکر مضمون "آیت لیطمئن قلبی کی ایک تاویل" میں جناب محمد ادریس فلاحی صاحب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک مشہور واقعہ کی نئی تاویل پیش کی ہے۔ عام مفسرین اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم نے اپنے اطمینان قلب کے لیے اللہ تعالیٰ سے مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کا مشاہدہ کرانے کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ چار پرندوں کو لے کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کریں پھر ان کا گوشت چار حصوں میں لے کر چار پہاڑوں پر رکھیں اور انھیں پکاریں تو معجزۂ الٰہی سے وہ پھر پرندے بن کر دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ مضمون نگار کے نزدیک مردوں (موتیٰ) سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل روحانی اور اخلاقی طور پر مردہ ہو گئے تھے۔ اور وہ آیات مذکورہ کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے آخری زمانے تک جبکہ وہ خانۂ کعبہ کی تعمیر کر چکے تھے۔ حضرت لوطؑ کے علاوہ ان پر کوئی ایمان نہ لایا تھا۔ چنانچہ جب انھیں بارگاہِ الٰہی سے امامت کا مژدہ سنایا گیا اور بشارت دی گئی کہ ان کے قائم کردہ گھر کا طواف کریں گے اور اس میں رکوع و سجود کریں گے تو انھیں یک گونہ خوشی ہوئی اور "انھوں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں خدا سے کہا کہ جن کے قلوب و اذہان انکار دعوت کی وجہ سے مردہ ہو چکے ہیں خدایا کس طرح تو انھیں زندگانی بخشے گا کہ خانۂ خدا کے مقصد کو پورا کریں گے اور میری امامت میں دوش بدوش اس کارِ عظیم کو سنبھالیں گے" (ص۳۳) اسی بات کو مضمون نگار کے نزدیک قرآن میں "کیفیت احیاء موتیٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کے بقول اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ چار پرندوں کو لو، انھیں اپنے سے مانوس کرلو، پھر ایک ایک پرندے کو ایک ایک پہاڑ پر رکھو پھر انھیں پکارو تو وہ دوڑتے ہوئے

آجائیں گے۔ اور یہ دراصل حضرت ابراہیم کے مذکورہ سوال کے جواب میں دعوتِ حق کی انقلاب انگیز حقیقت کی تمثیل ہے کہ جس طرح "تم ایک چڑیا کو مدت تک اپنے ساتھ رکھ کر تربیت یافتہ بنا سکتے ہو کہ وہ تمہاری آواز سننے اور بلانے پر اڑتی ہوئی آسکتی ہے۔ اسی طرح گمراہ انسان دعوتِ حق کی تعلیم و تربیت سے اس درجہ متاثر ہو سکتے ہیں کہ وہ تمہاری ان کوششوں کی قدر کریں اور مرکز توحید کے مقصد کو پورا کریں۔ (ص۳۷)

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ "انھوں نے قرآن و سنت اور لغتِ عرب کی روشنی میں سلف ہی کی ایک تاویل کو، جسے مفسرین نے عام طور پر نظر انداز کر دیا ہے، ترجیح دی ہے ص۲۲ لیکن سلف میں سے یہ تاویل کس نے اختیار کی ہے اس کا انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بحث کے دونوں اجزاء کو باہم خلط ملط کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلا جزء یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے سوال کیف تحیی الموتیٰ میں احیائے موتیٰ سے کیا مراد ہے؟ اور دوسرا جزء یہ کہ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو کیا کرنے کا حکم دیا تھا؟ دوسرے جزء کی تاویل میں مضمون نگار کو سلف میں سے بعض مفسرین کی تائید حاصل ہے مگر پہلے جزء میں غالباً انھیں کسی کی تائید حاصل نہیں ہے۔

مضمون نگار نے آیتِ مذکور کے پہلے جزء کی جو تاویل پیش کی ہے وہ اصولی طور پر قابلِ قبول ہو سکتی ہے اور یہ اس کی متعدد تاویلات میں سے ایک تاویل ہو گی۔ لیکن اولاً انھوں نے بعض قدیم مفسرین کی تائید حاصل ہونے کا جو دعوی کیا ہے وہ بلا ثبوت ہے۔ ثانیاً دیگر مفسرین کی تاویل پر انھوں نے جو سوالات اٹھائے ہیں وہ بے بنیاد ہیں۔ ذیل میں بہت اختصار کے ساتھ اس کی وضاحت کی جاتی ہے:

ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ اگر کیف تحیی الموتیٰ کا مطلب مردوں کو زندہ کرنا لے لیا جائے تو "اس طرح کے سوال کفار و مشرکین کیا کرتے ہیں۔ اگر یہی سوال حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کیا جائے تو نعوذ باللہ ان کی ثقاہت اور نبوت ہی خطرے میں پڑ جائے گی... کسی مومن یا نبی کے لیے اس طرح کا سوال کرنا اس کے ایمان و یقین کے منافی ہے" (ص۲۵) راقم کے نزدیک اس طرح کا سوال ایمان و یقین کے منافی نہیں ہے۔ کفار اور نبی دونوں کے اندازِ سوال میں فرق ہے۔ کفار قیامت و آخرت کا انکار کرتے ہوئے استہزاء و تمسخر میں یہ سوال کرتے تھے جبکہ نبی کا سوال مکمل ایمان کے ساتھ ہے

اس کی ایک نظیر ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ سے رؤیت کے مطالبہ میں ملتی ہے۔ مضمون نگار نے آگے ایک حاشیہ میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حضرت موسیٰؑ کا یہ مطالبہ مناسب نہ تھا" (ص۳۰) تو کیا ان کے نزدیک حضرت موسیٰؑ کی ثقاہت ونبوت خطرے میں پڑگئی تھی؟

ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ اطمینانِ قلب مشاہدۂ عینی کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآنی نظائر اس خیال کے خلاف ہیں" (ص۲۵) راقم کے نزدیک قرآنی نظائر سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم الیقین سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے مگر ان سے عین الیقین (جسے مقالہ نگار نے غلطی سے علم الیقین لکھا ہے ص۲۷) کے ذریعہ اطمینان حاصل ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ خود قرآن نے علم الیقین کے ساتھ عین الیقین کا تذکرہ کیا ہے (سورۂ تکاثر) اور مفسرین کی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ عینی مشاہدہ سے جس درجہ کی معرفت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ استدلال کے ذریعہ حاصل ہونے والے اطمینان سے بڑھ کر ہے۔ ضمناً یہاں یہ بتا دینے میں حرج نہیں کہ مضمون نگار نے اس سلسلہ میں مفسر خازن کی عبارت "ان العیان یفید من المعرفۃ والطمانینۃ مالا یفیدہ الاستدلال" کا جو ترجمہ کیا ہے "عینی مشاہدہ کا فائدہ معرفت اور اطمینانِ قلب کا حصول ہے جس سے استدلال کا فائدہ مطلوب نہیں ہے" (ص۳۰) وہ غلط ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا: "عینی مشاہدہ سے جس درجہ کی معرفت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے، اس درجہ کا اطمینان استدلال سے حاصل نہیں ہو سکتا"۔

مفسرین کی تاویل پر مقالہ نگار کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ "حضرت ابراہیمؑ احیاءِ موتیٰ کی کیفیت معلوم کرنا چاہتے تھے تو پھر اللہ تعالیٰ نے چار چڑیوں کو چار پہاڑوں پر رکھنے کی ہدایت کیوں کی؟ ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے سامنے ایک چڑیا کو مار کر زندہ کر دیا جاتا تاکہ اس منظر کو دیکھ کر قیامت پر ان کا یقین بڑھ جاتا (ص۲۶، ص۳۷) پھر چار پرندوں کی حکمت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے "چار پرندے چار پہاڑوں پر۔ گویا چہار جانب سے حجاج کے لشکر کے دوڑتے ہوئے آنے کی ایک جامع تعبیر ہے"۔ (ص۳۸) واقعہ یہ ہے کہ ایک مخصوص عینک سے دیکھنے کی وجہ سے ہی مقالہ نگار کو مفسرین کی تاویل کی صورت میں چار کے عدد کی کوئی حکمت نظر نہیں آئی۔ ورنہ واضح ہے کہ حضرت ابراہیم کے سوال میں 'موتیٰ'

جمع کا لفظ ہے اس لیے ایک چڑیا کے مرنے کے بعد زندہ ہونے کا منظر اس سوال کا جواب نہ ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ چار کی جو حکمت انھوں نے بتائی ہے وہ مفسرین کی تاویل پر بھی صادق آتی ہے اور وہ یہ کہ چار پرندوں سے اللہ تعالیٰ اس بات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا تھا کہ جس طرح اس وقت معجزۂ الٰہی سے چار پرندے زندہ ہو کر چار سمتوں سے اڑ کر تمہارے پاس آجائیں گے اسی طرح قیامت کے دن چہار سمتوں سے قدرتِ الٰہی سے مردے زندہ ہو ہو کر میدانِ حشر میں اکٹھا ہوں گے۔

مقالہ نگار کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ "اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ حضرت ابراہیم احیائے موتیٰ کے متعلق مشاہدۂ عینی کے خواہش مند تھے تو پھر اس آیت میں امتِ مسلمہ کے لیے کیا پیغام ہے؟ کیا ان کے لیے یہ پیغام تسلی ہے کہ دین کی دعوت انھیں بھی دنیا کو دینی ہے اس لیے وہ بھی احیائے موتیٰ کے متعلق اطمینانِ قلب کی خاطر مشاہدۂ عینی کا مطالبہ کریں تب جا کر لوگ اس دین کو اختیار کریں گے؟ (ص۲۶)

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اگر اسی طرح انبیاء کے معجزات اور ان کی امتیازی خصوصیات میں امت کے لیے پیغام تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تو دشواری پیدا ہو جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے شرفِ کلام سے بہرہ ور فرمایا۔ کیا اس میں امت کے لیے یہ پیغام ہے کہ وہ بھی فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑے ہونے سے قبل اللہ تعالیٰ سے مشرف بہ کلام ہونے کا انتظار کریں؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے جیل کے ساتھیوں کو ان کے خواب کی تعبیر بتائی پھر ان کے سامنے حق کی دعوت پیش کی۔ کیا اس میں امت کے لیے یہ پیغام مضمر ہے کہ ہر داعی کو تعبیر رویا کے علم سے بہرہ ور ہونا چاہیے تاکہ وہ دعوتِ دین میں اس سے استفادہ کر سکے؟

مفسرین کی مشترک تاویل (یعنی حضرت ابراہیم کے مطالبۂ مشاہدۂ عینی) کا جائزہ لیتے ہوئے مضمون نگار نے لکھا ہے "انبیاء سمیت پوری انسانیت سے قرآن کا پہلا مطالبہ ایمان بالغیب کا ہے ..... یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر نبی کے لیے غیب کی حقیقتوں پر ایمان لانا اور انسانوں کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دینا شرطِ اولین ہے ..... اس کا تقاضا تھا کہ حضرت ابراہیم اللہ تعالیٰ سے کوئی ایسا

مطالبہ نہ کریں جس کی وجہ سے ان کا ان دیکھی حقیقتوں پر ایمان و یقین بلکہ نبوت ہی خطرے میں پڑجائے۔“ (ص۲۸) واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے خود ”ایک ناقابل انکار حقیقت“ سے چشم پوشی کی ہے اور وہ یہ کہ غیبیات کے معاملہ میں انبیاء اور دیگر انسان برابر نہیں ہیں۔ فرشتے انسانوں کے لیے غیبیات میں سے ہیں اور ان پر ایمان، ایمان بالغیب میں سے ہے مگر وہ انبیاء کے سامنے عیاناً آتے ہیں، احادیث میں ہے کہ سفرِ معراج میں آنحضرتؐ نے حضرت جبرئیل کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا تھا۔ جنت و جہنم غیبیات میں سے ہیں مگر آنحضرتؐ کو سفر معراج میں ان کا مشاہدہ کرایا گیا۔ وجود باری تعالیٰ غیب درغیب ہے کہ اس سے مشرف بہ کلام ہونا کسی کے بس میں نہیں، مگر اس نے حضرت موسیٰؑ کو براہِ راست شرفِ کلام سے نوازا۔ اس لیے کسی غیبی چیز کے مشاہدہ کی درخواست پر نبوت کو خطرہ میں ڈالنا صحیح نہیں۔

فاضل مقالہ نگار نے اپنی تاویلِ نو کو مدلل کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی سراسر مفروضہ ہے۔ ان کے مطابق تعمیر کعبہ کے بعد تک“ پوری تاریخ میں حضرت لوط کے علاوہ کوئی بھی حضرت ابراہیم پر ایمان نہ لایا تھا۔ (ص۳۲) دلیل میں انھوں نے آیت ”فآمن لہ لوط“ (العنکبوت-۲۶) پیش کی ہے۔ مگر آیت کے مابعد ٹکڑے ”وقال اِنی مہاجر“ ہی سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ ہجرت کے وقت کی بات ہے جس کا زمانہ تعمیر کعبہ سے بہت پہلے کا ہے۔ قرآن میں اگرچہ صراحت سے یہ تذکرہ نہیں ملتا کہ تعمیر کعبہ کے وقت تک کتنے افراد حضرت ابراہیم پر ایمان لاچکے تھے۔ مگر متعدد اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اہلِ ایمان کا ایک گروہ تیار ہوگیا تھا۔ سورۂ حج کی آیت ہے:

واذن فی الناس بالحج یاتوک اور لوگوں میں حج کے لیے ندا کردو،
(الحج-۲۷) وہ تمہاری طرف آئیں گے۔

اگر اس وقت تک کوئی ایمان ہی نہ لایا تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کن لوگوں کے درمیان اعلانِ حج کرنے کا حکم دیا گیا تھا؟ اور اس اعلان کو سن کر کون لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آتے؟ یہاں یہ ذہن میں رہے کہ آیت میں ”یاتوک“ کا لفظ ہے (یعنی تمہارے پاس آئیں گے) اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے محض بشارت ہے کہ آپ کے اعلانِ عام کے نتیجہ میں آئندہ آپ کے بعد لوگ حج کرنے آئیں گے۔

فاضل مقالہ نگار نے مفہوم آیات کی تعیین میں نظم کی اہمیت کا بھی ذکر کیا ہے اور اپنی تاویل کو سیاق کی روشنی میں مدلل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن نظم آیات سے بھی ان کے مفہوم کی تائید نہیں ہوتی۔ کیونکہ زیر بحث آیت سے قبل متصلاً جو دو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں موت سے مراد حقیقی اور حسّی موت ہے۔ کسی بھی تاویل سے ان میں روحانی واخلاقی موت مراد نہیں لی جاسکتی۔ اس لیے نظم کا تقاضا ہے کہ آیت زیر بحث میں بھی حسّی موت مراد لی جائے نہ کہ روحانی واخلاقی موت۔

مقالہ نگار نے آیت کا ماقبل سے تعلق بیان کرتے ہوئے آیت الکرسی کا حوالہ دیا ہے۔ یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ انھوں نے "حی وقیوم" کا یہ مفہوم بیان کیا ہے "اللہ حی ہے اور زندہ قوم کو پسند کرتا ہے" (ص۳۹) جبکہ یہاں "زندہ قوم" کو پسند کرنے یا نہ کرنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کیونکہ "قیوم" مبالغہ کا وزن ہے اس کے معنی ہیں "وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور دوسروں کے قیام وبقا کا واسطہ اور ذریعہ ہو (تدبر قرآن اول ص۵۸۷) نہ کہ وہ ذات جو زندہ قوم کو پسند کرتی ہو۔

بہت اختصار کے ساتھ میں نے اپنی معروضات پیش کردی ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل کا موقع نہیں۔ آخر میں ایک بار پھر اپنا موقف واضح کردوں کہ میرے نزدیک مضمون نگار کی پیش کردہ تاویل تو قابل قبول ہوسکتی ہے اور وہ متعدد تاویلات میں سے ایک ہوگی مگر انھوں نے جس انداز سے مفسرین کی تاویل پر اعتراضات وارد کیے ہیں وہ نامناسب اور بے بنیاد ہیں۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی ایک اہم کتاب
ایمان وعمل کا قرآنی تصوّر
الطاف احمد اعظمی
○ ایمان وعمل کے مروجہ تصور کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ ○ قرآن وسنت کے نقطۂ نظر کی مدلل اور دلنشیں تشریح کرتی ہے۔ ○ ایمان وعمل کے تقاضے اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ واضح کرتی ہے۔
آفسٹ کی طباعت۔ خوبصورت سرورق۔ صفحات ۲۸۰ قیمت ۲۵ روپئے لائبریری ایڈیشن ۴۰ روپئے
ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲